

مولانا لطف اللہ علی گڑھی کو لطیف اللہ لکھا گیا ہے اور صفحہ ۹۷ پر مولانا غلام رسول (م ۱۲۹۱ھ) کے وطن "قلعہ سیہان سنگھہ،" کو قلعہ سہیان سنگھہ، کتابت کیا ہے۔

(اختر راہی)

برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقاء

صفحہ : قاضی جاوید : (lahore، ادارہ ثقافت پاکستان،

۱۹۷۷ء) ۲۲۷ صفحات — اشاریہ

طبعات : گوازا، ٹائیٹل دیدہ نازیب، قیمت : ۲۵ روپے

برصغیر میں مسلم فکر کی تاریخ پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ اس لحاظ سے قاضی جاوید صاحب کی یہ کوشش نہایت گران قدر ہے۔ صفحہ اس تاریخ کو تین جلدیں میں پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب ان میں سے پہلی جلد ہے جو برصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے دور مغلیہ تک کے فکری سفر کی تاریخ ہے۔ استعماری دور اور آزادی کے بعد کی فکری تاریخ بالترتیب دوسری اور تیسری جلدیں کا موضوع ہیں۔ کتاب محض واقعاتی ہی نہیں بلکہ توجیہاتی تاریخ بھی پیش کرتی ہے۔

صفحہ نے فکری تاریخ بیان کرتے ہوئے متعلقہ عہد کے فکری رجحانات کا عمومی تجزیہ پیش کرنے کی بجائے اس عہد کا اس کی نمایاں شخصیات کے حوالے سے مطالعہ کیا ہے۔ چنانچہ مغل دور تک کی فکری تاریخ کو چہ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں مسلمانوں کی سندھ میں آمد سے لے کر خاندان تغلق تک کے زمانے کو سید علی هجویری اور چشتیہ سلسلے کے مشائخ کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ اس باب میں سہروردیہ کا ذکر محض سرسری ہے۔

دوسرے باب میں اسی دور میں سفل دور کو بھی شامل رکھنے ہوئے قلندریہ، روشنیہ سلسلوں اور اکبر کے دینِ الہی کے حوالے سے مطالعہ کیا ہے۔ تھسرا باب شیخ سنیری رح، سہدی جولپوری، عبدالحق محدث دھلوی رح، مجدد الف ثانی رح اور چوتھا باب قادریہ بزرگوں کے افکار کا مطالعہ پیش کرتے ہیں۔ پانچھیں باب میں اورنگ زیب عالیگیر اور چھٹے میں شاہ ولی اللہ موضوع بحث ہیں۔

اس مختصر سے تبصرے میں کتاب کے سطحیات کا تفصیلی جائزہ یا تعزیہ تو ممکن نہیں البتہ مختصرًا یہ کہا جا سکتا ہے کہ مصنف نے بر صغير کی فکری تاریخ کو معروضی اور حقیقت پسندانہ انداز سے پیش کرنے میں جس جرأت سے کام لیا ہے وہ واقعی قابل ستائش ہے۔ ہمارے سماشہ میں جہاں اسلاف پرستی محض جذباتی نہیں بلکہ اعتقادی بن چکی ہے، اپنے بزرگوں کے افکار کا غیر جانبدار ائمہ تعزیہ پیش کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا ہے۔

تاہم معروضی سطحیات کے لئے جو بنیادی ضروریات ہیں ان میں سے دو کا ذکر اہم ہے۔ اول تو مأخذ کا مستعلہ ہے، یہ لازمی ہے کہ ثانی مأخذ پر انصار نہ کیا جائے۔ بر صغير کی تاریخ کے سلسلے میں تو اس کی ضرورت اور بھی شدید ہے کہ پہاں واقعاتی تاریخیں کم اور توجیہاتی زیادہ ہیں۔ یہ صورت حل محض ان تاریخی تصمیمات کی ہی نہیں جو دور جدید میں لکھی گئی ہیں بلکہ یہ بات ان بیشتر تاریخوں پر بھی صادق آتی ہے جو قرون وسطی میں لکھی گئی ہیں اور جسیں اولین مأخذ کا درجہ حاصل ہے۔ اس سے ہماری تاریخ نگاری خاصی غیر متوازن رہی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں مصنف نے اگرچہ یہ کہہ کر کہ ”واقعاتی قضایا کے مناسب طور پر حوالہ جات درج کر دئے گئے ہیں اس کے بعد میں ان کی ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں“، (دیباچہ) عنہدہ بر آ ہونے کی کوشش کی ہے لیکن یہ عذر بجائے خود ایک

کوتاہی کا اعتراف ہے۔ فکری تاریخ لکھنے والے کی ذمہ داری دو چند ہوتی ہے کیونکہ توجیہاتی قضایا کی بنیاد واقعاتی قضایا پر ہی استوار ہوتی ہے اور توجیہات کی صحت کا داروں دار واقعات کی صحت پر ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ غلط یا ناکافی واقعاتی معلومات سے صحیح توجیہات اخذ نہیں ہو سکتیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں یہ کمی کشی جگہ جھلکتی ہے مثلاً ان کا یہ توجیہاتی قضیہ کہ وحدت الوجودی تصوف اپنیشدون اور ویدانی تصویرات کا خوشہ چین تھا اس واقعاتی قضیے پر بنی ہے کہ بايزید بسطامی کے ایک استاد ابو علی السندی تھے جو هندی الاصل تھے۔ صفت نے اپنے ساخت کے طور پر پروفیسر زین اور مولانا عبید اللہ سنادھی کا نام لیا ہے۔ ہم اس واقعہ کی صداقت یا عدم صداقت کی تفصیل میں نہیں جائیں گے البتہ صفت نے جس طرح اسے مسلمہ اور متفقہ واقعہ کے طور پر پیش کیا ہے اس پر تعجب ضرور ہوتا ہے۔ صفت کو دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھنا چاہئے تھا۔ عربی میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے قطع نظر بھی انکریزی میں اس موضوع پر پروفیسر آربری کی تحقیقات اور ڈاکٹر عبدالرب کی بايزید بسطامی پر حالیہ کتاب اگر صفت کے پیش نظر ہوتیں تو سکن ہے ان کے توجیہاتی قضیے میں اگر تبدیل نہیں تو ہتمیت ضرور کم ہو جاتی۔ یہی صورت حال ”ملاتیہ“، شطراویہ اور روشنیہ کے بارے میں ہے۔ ان موضوعات پر تازہ تحقیقات اکثر مختلف نتائج پیش کرتی ہیں۔

اس رویے نے صفت کے تجزیے میں محض جزوی کوتاہیوں کو ہی جنم نہیں دیا بلکہ اس سے ان کا عمومی تجزیہ بھی مادر نہیا ہے۔ جس کو ہم معروضی مطالعہ کی دوسری بنیادی ضرورت سمجھتے ہیں۔ وہ ہے مطالعہ کا زاویہ۔ غیر متوازن اور یکطرفہ مطالعہ صحیح نتائج سہنا نہیں کر سکتا۔ اس کتاب میں یہ بات بڑی طرح کھٹکتی ہے کہ برصغیر میں مسلم فکر کی تاریخ کو تصوف کے دائرے میں محدود رکھا گیا ہے۔ فکر کے دوسرے شعبے یا تو سے سے نظر

انداز کر دئے گئے ہیں یا ان کا سرسزی ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً بالکل ابتدائی دور میں علم الحدیث اور ظاہری مذہب کے رواج کے اسباب و اثرات پر بالکل توجہ نہیں دی کی۔ بر صنیر کے فکری ارتقا کا نقطہ آغاز سید علی هجویری رح کو قرار دیا گیا ہے۔ البیرونی کا ذکر بالکل نہیں آیا۔ بعد میں بھی تصوف ہی غالب ہے دوسری شخصیات کا اگر ذکر ہے بھی تو صوفیہ کے حوالے سے، نتیجہ یہ ہے کہ بر صنیر کے فکری تاریخ سٹبلہ وحدت الوجود کے گرد ہی گھوستی نظر آتی ہے۔ یہ عدم توازن محض زیر تبصرہ کتاب ہی میں نہیں بلکہ بر صنیر میں اسلام کی تقریباً تمام تاریخوں میں پایا جاتا ہے۔ ان میں پروفیسر عزیز احمد اور ڈاکٹر تارا چند نمایاں ہیں۔ یہ بات غیر فطری محسوس ہوتی ہے کہ بر صنیر میں لوگ فکر کے صرف ایک میدان یعنی تصوف میں ہی سرگرم عمل رہے ہوں اور فلسفہ، بسطق، اصول فقه، کلام اور دوسرے میدانوں میں کوئی حصہ نہ لیا ہو۔

اس نقطہ نظر کے افروغ کی وجہ غالباً ہمارے بعض سورخین اور مصنفوں کا ہندو سسل تضادات کے باوے میں اعتذاری رویہ ہے۔ چنانچہ ان کا یہ اذعان رہا ہے کہ بر صنیر کے سیاق میں صوفیانہ نگارشات رواداری اور آزاد فکری کا مظہر ہیں، جب کہ فقہ اور کلام رجعت پسندی اور تنگ نظری کا۔ کتاب میں یہ رجحان خاصاً نمایاں ہے یہی وجہ ہے کہ مصنف نے معروضی اور توجیہاتی تاریخ پیش کرنے وقت اس عہد کے معاشرتی اور سیاسی عوامل کا پوری طرح تجزیہ نہیں کیا اور ستھانوں افکار کی نشوونما کو ان کے تاریخی عوامل کے پس منظر میں صحیح طرح سے نہیں رکھا۔ ورنہ اس یات کا قوی امکان تھا کہ وہ مختلف نتائج پر پہنچتے۔ ہمیں ابتداء ہے کہ مصنف باقی جملوں میں اس پہلو کو مد نظر رکھیں گے۔

اس عمومی تبصرے سے بہر حال نہ کتاب کی اہمیت میں کمی آتی ہے نہ مصنف کی کاوشوں کی تتفصیل ہوتی ہے۔ اتنے طویل دور کو سمیتا اور اتنے وسیع مأخذ

کا سطالعہ کر کے اتنے مختصر صفحات میں پیش کرنا آسان کام نہیں ۔ ہم مصنف کے عزم کی داد دیتے ہیں اور ان کی کامیابی پر تحسین کہتے ہیں ۔ البتہ شکایت ہے تو ناشرین سے ۔ یہ کتاب اس سلوک کی قطعاً مستحق نہیں تھی جو غیر معیاری طباعت اور سخت غیر جمالیاتی ٹائیپل کی صورت میں اس کے ساتھ کیا گیا ہے ۔

(محمد خالد مسعود)